پریم چند

(1880ء-1936ء)

ادیب کی عزّت

صبح کے وقت حضرت قمر نے بیس دفعہ اُبالی ہوئی چائے کا پیالا تیار کیا اور بغیر چینی اور دودھ کے پی گئے۔ یہی ان کا ناشتا تھا۔ دودھ اور چینی ان کے نزدیک ضروریاتِ زندگی میں نہ تھیں۔ گھر میں گئے ضرور، کہ بیوی کو جگا کر پیسے مانگیں، پر اُسے پھٹے میلے لحاف میں سوتے دیکھ کر جگانے کو جی نہ چاہا۔ سوچا شاید مارے سردی کے رات بھر نیند نہ آئی ہوگی، اس وقت جا کر آنکھ لگی ہے۔ کچی نیند جگا دینا مناسب نہ تھا۔ چپکے سے لَوٹ گئے۔

چائے پی کر انھوں نے قلم دوات سنبھالی اور وہ کتاب لکھنے میں محو ہو گئے۔ جو ان کے خیال میں اس صدی کی بہترین تصنیف ہوگی جس کی اشاعت ان کو قعرِ گمنامی سے نکال کر شہرت اور ناموری کے آسمان پر پہنچا دے گی۔ آدھ گھنٹا کے بعد بیوی آنکھیں ملتے ہوئے آکر بولی:

''چائے پی چکے؟''

قمر نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ''ہاں پی چکا، بہت اچھی بنی تھی۔''

''مگر دودھ اور چینی کہاں سے لائے؟''

''آج کل سادہ چائے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ دودھ اور چینی ملانے سے چائے کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹروں کی بھی یہی رائے ہے۔ یورپ میں تو دودھ کا بالکل رواج نہیں۔ یہ تو ہمارے ہاں کے رئیسوں کی ایجاد ہے۔''

''نہ جانے آپ کو پھیکی چائے کیونکر اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے جگا کیوں نہ لیا؟ پیسے رکھے تھے۔'' قمر نے جواب نہ دیا اور پھر لکھنے لگے۔ جوانی ہی میں انھیں یہ بیماری لگ گئی تھی اور آج بیس سال سے وہ اسے پالے ہوئے تھے۔ اس بے نیازی کی شان سے جو ادیبوں کی امتیازی صفت ہے، انھوں نے کسبِ معاش کے کسی اور ذریعہ کی طرف توجہ نہ کی۔ اس بیماری میں جسم گھل گیا۔ صحت گھل گئی اور چالیس سال کی عمر ہی میں بڑھاپے نے آکر گھیر لیا مگر یہ مرض لاعلاج ہے۔ طلوعِ آفتاب سے آدھی رات تک یہ ادب کا پجاری دنیا و مافیہا سے بے خبر فکرِ سخن میں غرق رہتا۔ اب انھیں یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ میرے مضامین میں کوئی خوبی کوئی معنی ہی نہیں، اور یہ انکشاف بدرجہ غایت ہمت شکن تھا۔ یہ عمر عزیز یوں تلف ہوگئی۔ یہ تسکین بھی نہیں کہ دنیا نے ناقدری کی ہو مگر ان کا کارنامۂ حیات حقیر نہیں۔ ضروریات زندگی گھٹتے گھٹتے زہد کی حدود کو بھی پار کر چکی تھیں۔ اگر کوئی تسکین تھی تو محض یہ کہ ان کی رفیقۂ حیات ترک و ایثار میں ان سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ سکینہ اس تباہ حالی میں بھی مطمئن تھی۔ قمر کو دنیا سے شکایت ہو مگر سکینہ ہمیشہ اس کی دلجوئی کرتی رہتی تھی۔ اپنے نصیبوں کو رونا تو دور کی بات تھی اس نے کبھی ماتھے پر بل بھی نہ آنے دیا۔ سکینہ نے چائے کا پیالہ سمیٹتے ہوئے کہا:

''تو جا کر گھنٹا آدھ گھنٹا کہیں گھوم پھر کیوں نہیں آتے۔ جب معلوم ہو گیا کہ جان دے کر کام کرنے سے بھی کوئی نتیجہ نہیں تو بیکار کیوں سر کھپاتے ہو؟''

قمر نے بغیر قلم اٹھائے ہوئے کہا!'' لکھنے میں کم از کم یہ تسلی تو ہوتی ہے کہ کچھ کر رہا ہوں۔ سیر کرنے میں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔''

''یہ اتنے لکھے پڑھے آدمی ہر روز ہوا کھانے جاتے ہیں تو یہ کیا اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟''

''مگر ان میں زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں جن کو سیر کرنے سے مالی نقصان نہیں ہوتا۔ اکثر تو سرکاری ملازم ہوتے ہیں جن کو ماہوار تنخواہ مل جاتی ہے یا ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی عوام میں عزت ہے، میں تو مل کا مزدور ہوں۔ تم نے کبھی مزدوروں کو بھی ہوا کھاتے دیکھا ہے جنھیں کھانے کی کمی نہیں ان کو ہوا کی ضرورت ہے۔ جنھیں روٹیوں کے لالے ہیں وہ ہوا کیا کھائیں گے؟ پھر تندرستی اور لمبی عمر کی بھی ان ہی کو ضرورت ہے۔ اس بار کو سر پر کچھ دن اور اٹھائے رکھنے کی خواہش مجھے کیا ضرور ہے۔''

سکینہ نے مایوسی میں ڈوبی ہوئی باتیں سنیں تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اندر چلی گئی۔ اس کا دل کہتا تھا، اس تپ کا پھل ایک دن انھیں ضرور ملے گا۔ دولت حاصل ہو نہ ہو لیکن قمر صاحب یاس کی حد تک جا پہنچے تھے، جہاں سے سمتِ مخالف میں طلوع ہونے والی امید کی سرخی بھی نہیں دکھائی دیتی۔

(۲)

ایک رئیس کے یہاں کوئی تقریب ہے۔ اس نے حضرت قمر کو بھی مدعو کیا ہے۔ آج ان کا دل خوشی کے گھوڑے پر بیٹھا ہوا ناچ رہا ہے۔ سارے دن وہ اسی تخیل میں محو رہے۔ راجا صاحب کن الفاظ میں ان کا خیر مقدم کریں گے اور وہ کن الفاظ میں ان کا جواب دیں گے۔ کن مضامین پر گفتگو ہوگی اور کن کن اصحاب سے ان کا تعارف کرایا جائے گا۔ سارا دن وہ انھی خیالات کے لطف اٹھاتے رہے۔ اس موقع کے لیے انھوں نے ایک نظم بھی تیار کی جس میں انھوں نے زندگی کو ایک باغ سے تشبیہ دی تھی۔ سراب ہستی ان کے زورِ طبع کے لیے زیادہ موزوں چیز تھی مگر وہ آج رئیسوں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگا سکتے تھے۔

دوپہر ہی سے انھوں نے تیاریاں شروع کیں۔ حجامت بنائی۔ صابن سے نہائے۔ سر میں تیل ڈالا، دقت کپڑوں کی تھی۔ مدت گزری، جب انھوں نے ایک اچکن بنوائی تھی۔ اس کی حالت بھی ان کی سی تھی جیسے ذرا سی سردی یا گرمی سے انھیں زکام یا سر درد ہو جاتا تھا اسی طرح وہ اچکن بھی نازک مزاج تھی۔ اسے نکالا اور جھاڑ پونچھ کر رکھا۔

سکینہ نے کہا'' تم نے ناحق وہاں جانا منظور کیا، لکھ دیتے میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ان پھٹے حالوں جانا تو اور بھی بُرا ہے۔''

قمر نے فلاسفروں کی سی سنجیدگی سے کہا'' جنھیں خدا نے دل اور سمجھ دی ہے وہ آدمیوں کا لباس نہیں دیکھتے، ان کے منہ دیکھتے ہیں۔ آخر کچھ بات تو ہے کہ راجا صاحب نے مدعو کیا ہے۔ میں کوئی عہدے دار نہیں، زمیندار نہیں، جاگیر دار نہیں، ٹھیکہ دار نہیں، معمولی ایک شاعر ہوں۔ شاعر کی قیمت اس کی نظمیں ہوتی ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے مجھے کسی کے سامنے نادم ہونے کی ضرورت نہیں۔''

سکینہ ان کی سادگی پر ترس کھا کر بولی ''تم خیالات کی دنیا میں رہتے رہتے حقیقی دنیا سے بالکل بے گانہ ہو گئے ہو۔ میں کہتی ہوں راجا صاحب کے یہاں لوگوں کی نگاہ سب سے زیادہ کپڑوں ہی پر پڑے گی۔ سادگی ضرور اچھی چیز ہے لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں کہ آدمی بیوقوف ہی بن جائے۔''

قمر کو اس دلیل میں کچھ جان نظر آئی۔ اہلِ نظر کی طرح انھیں اپنی غلطیوں کے اعتراف میں پس وپیش نہ ہوتا تھا۔ بولے:

''میرا خیال ہے چراغ جل جانے کے بعد جاؤں۔''

''میں تو کہتی ہوں جاؤ ہی کیوں؟''

''اب تم کو کیسے سمجھاؤں۔ ہر شخص کے دل میں اعزاز واحترام کی بھوک ہوتی ہے۔ تم پوچھو گی یہ بھوک کیوں ہوتی ہے؟ اس لیے کہ یہ ہماری روح کے ارتقا کی ایک منزل ہے۔ ہم اس عظیم الشان طاقت کا لطیف حصہ ہیں جو ساری دنیا میں حاضر وناظر ہے۔ جزو میں کل کی خوبیاں ہونا لازمی امر ہے۔ اس لیے جاہ ورفعت علم وفضل کی جانب ہمارا فطری میلان ہے۔ میں اس ہوس کو معیوب نہیں سمجھتا۔ ہاں! چونکہ دل میں ضعف ہے۔ اہلِ دنیا کی حرف گیریوں کا خیال قدم قدم پر دامن گیر ہو جاتا ہے۔''

سکینہ نے گلا چھڑانے کے لیے کہا ''اچھا بھئی جاؤ۔ میں تم سے بحث نہیں کرتی لیکن کل کے لیے کوئی سبیل سوچتے جاؤ کیونکہ میرے پاس صرف ایک آنہ اور رہ گیا ہے۔ جن سے قرض مل سکتا تھا ان سے لے چکی اور جس سے لیا اُسے دینے کی نوبت نہیں آئی۔ مجھے تو اب اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔''

قمر نے ایک لمحہ کے بعد کہا ''دو ایک اخباروں سے روپیا آنے والا ہے۔ شاید کل تک آجائے اور اگر فاقہ کشی ہی کرنی پڑے تو کیا فکر ہے۔ ہمارا فرض کام کرنا ہے۔ ہم کام کرتے ہیں اور دل وجان سے کرتے ہیں۔ اگر اس کے باوجود فاقہ کرنا پڑے، تو میرا قصور نہیں۔ مر ہی تو جاؤں گا۔ ہمارے جیسے لاکھوں آدمی آئے دن مرتے رہتے ہیں۔ دنیا کا کوئی کام بند نہیں ہوتا۔ تم ہی کہو میں جو کچھ کرتا ہوں، اس سے زیادہ میرے امکان میں کیا ہے؟ ساری دنیا میٹھی نیند سوتی ہے اور میں قلم لیے بیٹھا رہتا ہوں۔ لوگ سیر وتفریح کرتے ہیں، کھیلتے کودتے ہیں۔ میرے لیے سب کچھ حرام ہے۔ یہاں تک کہ مہینوں سے ہنسنے کی نوبت نہیں آئی۔ عید کے دن بھی میں نے تعطیل نہیں منائی۔ بیمار ہوتا ہوں، جب بھی لکھتا ہوں۔ سوچو تم بیمار تھیں اور میرے پاس حکیم کے پاس جانے کے لیے بھی وقت نہ تھا۔ اگر دنیا نہیں قدر کرتی نہ کرے۔ اس میں دنیا ہی کا نقصان ہے میرا تو کوئی نقصان نہیں۔ چراغ کا کام جلنا ہے۔ اس کی روشنی پھیلتی ہے یا اس کے سامنے کوئی دیوار ہے، اسے اس سے مطلب نہیں۔ میرا بھی ایسا کون دوست، شناسا یا رشتہ دار ہے جس کا میں شرمندۂ احسان نہیں۔ یہاں تک کہ اب گھر سے نکلتے بھی شرم آتی ہے۔ اطمینان صرف اتنا ہے کہ لوگ مجھے بدنیت تصور نہیں کرتے۔ خواہ وہ میری کچھ زیادہ امداد نہ کر سکیں مگر انھیں مجھ سے ہمدردی ہے۔ میری خوشی کے لیے اسی قدر کافی ہے کہ آج مجھے ایک رئیس نے بلایا ہے۔''

پھر معاً ان پر نشہ سا چھا گیا۔ غرور سے بولے:

''نہیں اب رات کو نہ جاؤں گا۔ جسے راجا لوگ مدعو کریں، وہ ایسا ویسا آدمی نہیں ہو سکتا۔ راجا صاحب معمولی رئیس نہیں۔

اگر اب بھی کوئی مجھے معمولی آدمی سمجھے، تو اس کی عقل کا فتور ہے۔''

(۳)

شام کے وقت حضرت قمر اپنی پھٹی پُرانی اچکن، سڑے ہوئے جوتے اور بے تکی سی ٹوپی پہنے گھر سے نکلے تو گنوار اُچکے سے معلوم ہوتے تھے۔ ڈیل ڈول اور چہرے مہرے کے آدمی ہوتے تو اس ٹھاٹھ میں بھی ایک شان ہوتی۔ فربہی بجائے خود بارُعب شے ہے مگر ادبی خدمت اور فربہی میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اگر کوئی ادیب موٹا تازہ ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس میں سوز نہیں، لوچ نہیں، دل نہیں۔ پھر بھی اکڑے جاتے تھے۔ ایک ایک عضو سے غرور ٹپکتا تھا۔

یوں گھر سے نکل کر وہ دکان داروں سے آنکھ بچا کر نکل جاتے تھے مگر آج وہ گردن اٹھائے ان کے سامنے سے جا رہے تھے۔ آج وہ ان کے تقاضوں کا دنداں شکن جواب دینے کو تیار تھے مگر شام کا وقت تھا ہر ایک دکان پر خریداروں کا ہجوم تھا۔ کوئی ان کی طرف نہیں دیکھتا۔ جس رقم کو وہ بہت زیادہ سمجھتے تھے، وہ دکان داروں کی نگاہوں میں معمولی تھی۔ کم از کم ایسی نہ تھی جس کی خاطر وہ کسی کی عزت اُتار کر رکھ دیں۔ حضرت قمر نے ایک مرتبہ سارے بازار کا چکر لگایا، پر جی نہ بھرا۔ تب دوسرا چکر لگایا اس سے بھی کچھ نہ بنا۔ تب وہ خود حافظ صمد کی دکان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ حافظ صاحب بساطی کا کام کرتے تھے۔ قمر کو دیکھ کر بولے ''واہ حضرت! ابھی تک چھاتے کے دام نہیں ملے۔ ایسے سو پچاس گاہک مل جائیں تو دیوالہ نکل جائے۔ اب تو دن بہت ہو گئے۔''

حضرت قمر کی باچھیں کھل گئیں۔ دل کی مراد پوری ہوئی۔ بولے ''میں بھولا نہیں ہوں حافظ صاحب، ان دنوں کام کی اس قدر زیادتی رہی کہ گھر سے نکلنا دشوار تھا۔ روپیا تو ہاتھ نہیں آتا پر آپ کی دُعا سے قدر شناسوں کی کمی نہیں۔ دو چار آدمی گھیرے ہی رہتے ہیں۔ زندگی وبال ہے۔ اس وقت بھی راجا صاحب..... اجی وہی جونکڑ والے بنگلے میں رہتے ہیں ان ہی کے یہاں جا رہا ہوں، روز کوئی نہ کوئی ایسا ہی موقع آتا رہتا ہے۔''

حافظ صاحب مرعوب ہو گئے..... ''اچھا آپ راجا صاحب کے ہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ ٹھیک ہے۔ آپ جیسے باکمالوں کی قدر رئیس ہی کر سکتے ہیں اور کون کرے گا۔ اگر کوئی موقع ہاتھ آئے تو غریب کو بھول نہ جائیے گا۔ راجا صاحب کی اگر ادھر نگاہ ہو جائے تو پھر کیا پوچھنا، ایک پورا بساط خانہ تو ان ہی کے لیے درکار ہے۔ ڈھائی تین لاکھ سالانہ کی آمدنی ہے۔''

قمر صاحب کو ڈھائی تین لاکھ کی آمدنی حقیر سی معلوم ہوئی۔ زبانی جمع خرچ ہے تو بیس لاکھ کہنے میں کیا حرج ہے؟ بولے ''ان کی آمدنی دس لاکھ سے کم نہیں۔ ایک صاحب کا اندازہ تو بیس لاکھ کا ہے۔ مکان ہے، دکانیں ہیں، ٹھیکہ ہے، امانتی روپے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سرکار بہادر کی نگاہ ہے۔''

حافظ نے بڑے عجز سے کہا ''یہ دکان آپ کی ہے۔ جناب بس اتنی ہی عرض ہے۔ اے مرادی، ذرا دو پیسے کے اچھے پان تو بنوا لا۔ آپ کے لیے۔ آیئے دو منٹ بیٹھیے، کوئی چیز دکھاؤں گا۔ آپ سے تو گھر کا معاملہ ہے۔''

قمر نے پان کھاتے ہوئے کہا ''اس وقت تو معاف رکھیے۔ وہاں دیر ہو گی، پھر کبھی حاضر ہوں گا۔''

یہاں سے اٹھ کر وہ ایک کپڑے والے کی دکان پر رُکے۔ انھیں دیکھ کر آنکھیں اٹھائیں ۔ بے چارہ ان کے نام کو رو بیٹھا تھا۔ سوچتا تھا شاید کہیں چلے گئے۔ سمجھا روپے دینے آئے ہیں۔ بولا:

''بھائی، آپ نے تو بہت دن سے درشن ہی نہیں دیے۔ کئی بار رقعہ بھیجا، مگر آدمی کو آپ کے مکان کا پتا نہ تھا۔ منشی جی ذرا دیکھو تو آپ کے نام کیا نکلتا ہے؟''

قمر کی روح تقاضوں سے کانپتی تھی، لیکن آج اس طرح بے فکر کھڑے تھے جیسے کوئی آہنی خود پہن لیا ہو۔ جس پر کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہوتا۔ بولے ''ذرا راجا صاحب کے یہاں ہو آؤں تو بے فکر ہو کر بیٹھوں۔ اس وقت نہیں جلدی میں ہوں۔''

راجا صاحب پر کئی سو روپے نکلتے تھے۔ پھر بھی ان کا دامن نہ چھوڑتا تھا۔ ایک کے تین وصول کرتا۔ اس نے قمر کو بھی اس جماعت میں رکھ لیا جس کا پیشہ رئیسوں کو لوٹنا ہے۔ بولا:

''پان تو کھاتے جایئے جناب! راجا صاحب ایک دن کے ہیں، ہم تو بارہ مہینوں کے ہیں۔ کچھ کپڑا درکار ہو تو لے جایئے، عید آ رہی ہے۔ موقع ملے تو راجا صاحب کے خزانچی سے کہنا ''پرانا حساب بہت دنوں سے پڑا ہے، اب تو صاف ہو جائے۔ اب ہم ایسا کون سا نفع لے لیتے ہیں کہ دو دو سال تک حساب ہی نہ ہو۔''

قمر بولے ''اس وقت پان وان رہنے دو بھائی۔ دیر ہو جائے گی۔ جب انھیں مجھ سے ملنے کا اس قدر اشتیاق ہے اور میرا اتنا ادب کرتے ہیں تو میرا بھی فرض ہے کہ انھیں تکلیف نہ ہونے دوں۔ ہم تو قدر دانی چاہتے ہیں، دولت کے بھوکے نہیں۔ کوئی ہمیں چاہے تو ہم اس کے غلام ہیں۔ کسی کو ریاست کا غرور ہے تو ہمیں بھی اپنے علم و کمال کا غرور ہے۔''

(۴)

حضرت قمر راجا صاحب کے بنگلے کے سامنے پہنچے تو دیے جل چکے تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی موٹریں کھڑی تھیں۔ دروازے پر وردی پوش دربان کھڑے تھے۔ ایک صاحب مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ قمر کو دیکھ کر وہ جھجکے، پھر انھیں سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولے ''آپ کے پاس کارڈ ہے؟''

قمر صاحب کی جیب میں کارڈ تھا، مگر اس مطالبے پر انھیں غصہ آ گیا۔ انھی سے کیوں کارڈ مانگا گیا؟ اوروں سے تو کوئی پوچھتا نہیں۔ بولے:

''میرے پاس تو کوئی کارڈ نہیں، اگر آپ دوسروں سے کارڈ مانگتے تو میں بھی دکھا دیتا۔ ورنہ میں اسے اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ آپ راجا صاحب سے کہہ دیجیے گا، قمر آیا تھا، لوٹ گیا۔''

وہ بولے ''نہیں نہیں جناب، اندر چلیے، آپ سے تعارف نہ تھا۔ معاف فرمایئے۔ آپ ہی جیسے اصحاب سے تو محفل کی رونق ہے۔ خدا نے آپ کو وہ کمال عطا فرمایا ہے کہ سبحان اللہ۔''

اس شخص نے قمر کو کبھی نہ دیکھا تھا مگر اس نے جو کچھ کہا وہ ہر ایک مصنف، ہر ایک شاعر کے متعلق کہا جا سکتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ

کوئی ادیب اس داد سے مستثنیٰ نہیں۔

قمر اندر پہنچے تو دیکھا کہ بارہ دری کے سامنے وسیع اور آراستہ احاطے میں بجلی کے لیمپ روشن ہیں۔ وسط میں ایک حوض ہے اور حوض میں سنگ مرمر کی ایک پری۔ پری کے سر پر فوارہ۔ فوارے کی پھواریں رنگین لیمپوں سے رنگین ہو کر ایسی معلوم ہوتی تھیں، جیسے قوسِ قزح پگھل کر رس رہا ہو۔ حوض کے چاروں طرف میزیں لگی تھیں۔ میزوں پر سفید پوش، ان پر خوب صورت گلدستے.....۔

قمر کو دیکھتے ہی راجا صاحب نے خیر مقدم کیا'' آیئے آیئے، اب کے آپ کی نظم دیکھ کر تو دل خوش ہو گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا، اس شہر میں آپ جیسے رتن بھی چھپے ہوئے ہیں۔''

پھر بیٹھے ہوئے احباب سے ان کا تعارف کرانے لگے'' آپ نے حضرت قمر کا نام تو سنا ہوگا؟ وہ آپ ہی ہیں۔ کیا شیرینی ہے، کیا جدت ہے، کیا تخیل ہے، کیا روانی ہے، کیا ندرت ہے کہ واہ! میرا دل تو آپ کی چیزیں پڑھ کر ناچنے لگتا ہے۔''

ایک صاحب نے جو انگریزی سوٹ میں تھے، قمر کو ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا وہ چڑیا گھر کا کوئی جانور ہو اور بولے'' آپ نے انگریزی شاعری کا بھی مطالعہ کیا۔ بائرن، شیلے، ٹینی سن وغیرہ؟''

قمر نے بے اعتنائی سے جواب دیا'' جی ہاں تھوڑا بہت دیکھا ہے۔''

'' آپ ان استادانِ فن کی کتابوں میں سے کسی کا ترجمہ کر دیں تو آپ اپنی زبان کی بڑی خدمت کریں۔''

قمر اپنے آپ کو بائرن، شیلے سے جو بھر کم نہ سمجھتے تھے۔ بولے'' ہمارے یہاں روحانیت کا ابھی اتنا فقدان نہیں ہوا کہ مغربی شاعروں سے بھیک مانگیں۔ میرا خیال ہے کم از کم اس مضمون میں ہم اب بھی مغرب کو بہت کچھ سکھا سکتے ہیں۔''

انگریزی پوش صاحب نے قمر کو پاگل سمجھا۔ راجا صاحب نے قمر کو ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں ذرا موقع و محل دیکھ کر باتیں کرو اور بولے'' انگریزی لٹریچر کا کیا کہنا۔ شاعری میں تو اس کا جواب نہیں ہے۔''

انگریزی پوش'' ہمارے شاعروں کو ابھی تک اتنا بھی معلوم نہیں کہ شاعری کے کیا معنی ہیں وہ ابھی تک ہجر و وصال کو شاعری کا منتہائے مقصود سمجھے بیٹھے ہیں۔''

قمر نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا'' میرا خیال ہے آپ نے ہندوستانی شعرا کا کلام ابھی تک دیکھا ہی نہیں اور اگر دیکھا ہے تو سمجھا نہیں۔''

راجا صاحب نے قمر کا منہ بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بولے'' آپ کے مضامین انگریزی اخبارات میں چھپتے ہیں اور لوگ انھیں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔''

اس کے معنے یہ ہیں کہ اب آپ زیادہ نہ بھکیے۔ ایک اور صاحب آئے۔ راجا صاحب نے تپاک سے ان کا بھی استقبال کیا۔'' آیئے ڈاکٹر، مزاج تو اچھے ہیں؟''

راجا صاحب نے قمر کا تعاف کرایا ''آپ حضرت قمر شاعر ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے خاص انداز سے کہا ''اچھا! آپ شاعر ہیں۔'' اور بغیر کچھ کہے سنے آگے بڑھ گئے۔

یہ تماشا کئی مرتبہ ہوا اور ہر بار قمر کو یہی داد ملی ''اچھا آپ شاعر ہیں۔''

یہ الفاظ ہر مرتبہ قمر کے دل پر نیا صدمہ پہنچاتے تھے۔ ان کا باطنی مفہوم قمر سے چھپا نہ تھا۔ عام فہم الفاظ میں یہ مطلب تھا ''تم اپنے خیالی پلاؤ پکاتے ہو پکاؤ۔ یہاں تمھارا کیا کام؟ تمھارا اتنا حوصلہ کہ اس محفل میں چلے آؤ؟''

قمر اپنے اوپر جھنجھلا رہے تھے۔ دعوتی کارڈ پا کر وہ پھولے نہ سمائے تھے لیکن یہاں آ کر ان کی جس قدر تذلیل ہوئی اس کو دیکھ کر اپنا اطمینان کا جھونپڑا جنت سے کم نہ تھا۔ انھوں نے اپنے آپ کو طعن کی۔ ''تمھارے جیسے عزت کے ہوس مندوں کی یہی سزا ہے۔ اب تو آنکھیں کھلیں کہ تم کتنی عزت کے مستحق ہو۔ تم خود اس غرض مند دنیا میں کسی کے کام نہیں آ سکتے۔ وکیل تمھارا احترام کیوں کریں؟ تم ان کے مؤکل نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر اور حکیم تمھاری طرف کیوں دیکھیں؟ انھیں بغیر فیس کے گھر آنے کی ضرورت نہیں۔ تم لکھنے کے لیے بنے ہو۔ لکھتے جاؤ۔ اس دنیا میں تمھارا اور کوئی مصرف نہیں۔''

یکا یک لوگوں میں ہل چل مچ گئی۔ آج کا جلسہ جن صاحب کے اعزاز میں تھا وہ یورپ سے کوئی بڑی ڈگری لے کر آئے تھے۔

راجا صاحب نے لپک کر ان سے ہاتھ ملایا اور قمر سے بولے ''آپ اپنی نظم تو لائے ہوں گے؟''

قمر نے جواب دیا ''میں نے کوئی نظم تیار نہیں کی۔''

''سچ اب تو آپ نے غضب ہی کر ڈالا۔ ارے بھلے آدمی تو اب ہی بیٹھ کر کوئی چیز لکھ لو، دو چار شعر ہی ہو جائیں۔ ایسے موقع پر نظم کا پڑھا جانا لازمی ہے۔''

''میں اس قدر جلد کوئی چیز نہیں لکھ سکتا۔''

''میں نے بیکار اتنے آدمیوں سے آپ کا تعارف کرایا۔''

''بالکل بیکار۔''

''ارے بھائی جان، کسی پرانے شاعر ہی کی کوئی چیز سنا دیجیے۔ یہاں کون جانتا ہے۔'' ''جی نہیں، معاف فرمایئے۔ میں بھاٹ یا میراثی نہیں ہوں۔'' یہ کہتے کہتے حضرت قمر وہاں سے چل دیے۔

گھر پہنچے تو ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ سکینہ نے خوش ہو کر پوچھا۔

''اتنی جلدی کیونکر چلے آئے؟''

''میری وہاں ضرورت نہ تھی۔''

''چہرہ کھلا ہوا ہے، خوب عزت افزائی ہوئی ہوگی؟''

''ایسی کہ خواب میں بھی امید نہ تھی۔''

''خوب خوش ہو رہے ہو؟''

''اس لیے، کہ آج مجھے ہمیشہ کے لیے سبق مل گیا۔ میں چراغ ہوں اور جلنے کے لیے ہوں۔ میں یہ بات بھول گیا تھا۔ مگر خدا نے مجھے زیادہ بھٹکنے نہ دیا۔ میرا یہ جھونپڑا ہی میرے لیے جنت ہے۔ میں نے آج سمجھ لیا، کہ ادبی خدمت پوری عبادت ہے۔''

(آخری تحفہ)

مشق

1- درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں۔

i- حضرت قمر نے چائے کا پیالا تیار کیا۔

(الف) بیس دفعہ اُبالی ہوئی۔ (ب) تیس دفعہ اُبالی ہوئی۔

(ج) چالیس دفعہ اُبالی ہوئی۔ (د) پچاس دفعہ اُبالی ہوئی۔

ii- حضرت قمر کی رائے میں چائے میں دودھ ملانا

(الف) ہمارے رئیسوں کی ایجاد ہے۔ (ب) ہمارے غریبوں کی ایجاد ہے۔

(ج) ہمارے حکم رانوں کی ایجاد ہے۔ (د) ہماری عوام کی ایجاد ہے۔

iii- حضرت قمر کی بیوی کا نام تھا۔

(الف) رضیہ (ب) رفعیہ (ج) نصیبہ (د) سکینہ

iv- قمر صاحب کے پاس روپے کہاں سے آنے والے تھے؟

(الف) اخباروں سے (ب) دکان داروں سے (ج) رئیسوں سے (د) شاعروں سے

2- مختصر جواب لکھیں۔

i- قمر صاحب نے اپنے ہنسنے کے بارے میں کیا کہا؟

ii- قمر صاحب رئیس کے ہاں کیسے کپڑے پہن کر گئے؟

iii- قمر صاحب رئیس کے ہاں جاتے وقت کن لوگوں سے ملے؟

iv- قمر صاحب نے کارڈ مانگنے پر کیا کہا؟

v- قمر صاحب نے انگریزی ادب کے بارے میں کیا کہا؟

vi- قمر صاحب نے لکھنے پڑھنے کے کام کو عبادت کیوں کہا؟

vii- افسانہ نگار نے اس افسانے کا نام ''ادیب کی عزت'' کیوں رکھا؟

3- پریم چند کے افسانے ''ادیب کی عزت'' کا خلاصہ لکھیے۔